رمزِ اقبالؒ

علامہ اقبال کے تصوّرِ خودی پر
اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی
کے حوالے سے آسان اور
دلچسپ انداز میں بحث

مؤلفہ:
ڈاکٹر سیّد عبداللہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

رموزِ اقبال

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

ہمالیہ بک ہاؤس دہلی

جملہ حقوق محفوظ

پہلی بار - ستمبر ۱۹۷۱ء
تعداد طبع - ۵۰۰

قیمت - دو روپے

کتبہ : امان مرزا امروہوی

(کھنہ لیتھو پریس دہلی)

فہرست

۱۔ خودی ' ۱۱

۲۔ اسرارِ خودی ' ۱۴

۳۔ خودی کا سلسلۂ عمل :

(۱) تخلیق مقاصد ' ۲۴

(۲) عشق ' ۲۷

(۳) پیکار ' ۳۲

(۴) پیکار و ابلیس ' ۳۷

۴۔ خودی کا استحکام :

تعلیم و تربیت ' ۴۱

ضبطِ نفس ۴۴

عقل ۴۹

۵۔ اجتماعی خودی ' ۵۴

رموزِ بے خودی (اجتماعی زندگی) ۵۵

۶۔ ملّتِ اسلام :

تمدّن کی بنیادیں ۶۰

خودی کا ضعف ۶۳

شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبال کے شعر و فکر کا مرکزی اور بنیادی موضوع خودی کا فلسفہ ہے۔ یہ فلسفہ حیات بڑا سادہ اور سہل بھی ہے اور بڑا مشکل اور دشوار بھی۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

جن افراد اور اقوام میں فقرِ غیور کی صفت زندہ ہوتی ہے، وہ اس فلسفۂ حیات کو بڑی آسانی سے سمجھ جاتی ہیں اور کارزارِ حیات میں اس کا عملی نمونہ پیش کرتی ہیں۔ اور جن افراد و اقوام کی غیرت و حمیت سو رہی ہو، وہ اس کے بارے میں فلسفیانہ انداز کی موشگافیاں کرتے رہ جاتے ہیں۔ اور فلسفی کی ذہنی ریاضت کا ثمر تو سب کو معلوم ہی ہے۔ بقول اکبر الہ آبادی:

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

یہی حال کچھ ہم لوگوں کا ہے کہ اقبال کے تصورِ خودی کا چرچا تو بہت کرتے ہیں لیکن اس تصور سے جو مثبت عمل پیدا ہونا چاہئے، وہ ناپید ہے۔ اس کی بڑی وجہ تو ہمارا گزشتہ صد سالہ دورِ محکومی ہے جس نے ہمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر اس قدر بے حس، سہل انگار، اور تن پروری کا عادی بنا دیا ہے کہ حصولِ آزادی کے بعد بھی اب تک وہ جذبۂ ایثار اور احساسِ ذمہ داری

ہم میں پیدا نہیں ہوا جو آزاد قوموں کا خاص شیوہ ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی تفسیر کرنیوالوں نے اپنی ذہنی موشگافیوں سے اس سیدھے سادھے مسئلہ کو پیچیدہ تر بنا دیا ہے۔ علامہ اقبال کے افکار و اشعار پر بے شمار تالیف ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ ان میں فلسفۂ خودی پر بڑی عالمانہ بحثیں ہوتی ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بڑی اونچی ذہانت کی ضرورت ہے۔ عام قاری اور طالب علم بیچارہ اتنا ذہین اور فطین نہیں ہوتا کہ وہ ان فاضل نقادوں کی عالمانہ پروازوں کا ساتھ دے سکے۔ وہ اپنی ذہنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کو موردِ الزام قرار دیکر خاموش رہ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ عام قاری اقبال کے تصورِ خودی کے شیدائی تو ضرور ہیں لیکن اس کے مفہوم سے بے خبر۔ مثلاً ہمارے اکثر نوجوان طلباء کو اقبال کا یہ شعر عموماً یاد ہوتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

لیکن خودی کی ماہیت اور اس کے طریقِ کار اور سلسلۂ عمل کے بارے میں معلومات محدود ہونے کی وجہ سے وہ اس کا مفہوم بیان کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ عام طلبہ کی ایک دشواری یہ بھی ہے کہ اقبال کا تصورِ خودی ان کی فارسی مثنویات اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی میں بیان ہوا ہے۔۔۔ مطالعہ فارسی کے انحطاط کی وجہ سے عام قاری اور طلبہ ان مثنویات سے استفادہ کم کرتے ہیں۔ ادھر مفسرینِ اقبال اپنی تنقیدی آراء کے ساتھ اسرار و

رموز کے پیوند بغیر کسی تشریح یا ترجمے کے لگاتے جاتے ہیں۔ اس طرح قاری کے پلے بہت کم پڑتا ہے۔

عام قاری اور طلباء کی ان مشکلات کو محسوس کرتے ہوئے۔ استادِ گرامی، ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے اس تالیف کا آغاز چند برس ہوئے کیا تھا تاکہ حضرت علامہ کے افکار کو زیادہ سے زیادہ سلیس اور عام فہم انداز میں بیان کر دیا جائے۔ تو گویا یہ تالیف علماء کے لئے نہیں، بلکہ عام قاری اور طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے۔ تاہم علماء بھی اس سے استفادہ کرنا چاہیں تو کوئی قدغن نہیں ہے۔ سید صاحب نے ایک حقیقی معلم کی طرح زندگی گذاری ہے۔ درس دیتے ہوئے ہی نہیں بلکہ لکھتے ہوئے بھی ان کے سامنے سب سے پہلے طلبہ اور عام قاری ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنی تعقیدات میں مفکرانہ پرواز کے بجائے مدرسانہ انداز میں پیدل چلنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے بعض دانشوروں کو یہ "مدرسانہ تنقید" بہت کھٹکتی ہے۔ لیکن عام قاری کے نقطۂ نظر سے یہ تنقید زیادہ مفید ہوتی ہے کیوں کہ اس سے طالبانِ علم کو کسی نتیجے پر پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں سید صاحب کے پیشِ نظر یہ بات رہی ہے کہ عام قاری کے لئے فکرِ اقبال تک رسائی آسان ہو جائے۔ اس لئے اس میں مدرسانہ انداز کو بطورِ خاص اختیار کیا گیا ہے۔

سید صاحب نے اسرار و رموز کے حوالے سے اقبال کے تصورِ خودی

کے بنیادی موضوعات کو اس مختصر تالیف میں واضح طور پر بیان کر دیا ہے مثلاً خودی کی ماہیت، خودی کے سلسلۂ عمل میں تخلیقِ مقاصد، عشق، عقل، پیکار، ابلیس وغیرہ، خودی کے استحکام میں تعلیم و تربیت اور پھر فرد کی تعمیرِ خودی کے بعد جماعت خودی کی تعمیر، یہ سب مباحث اس میں آگئے ہیں اور یہی وہ مباحث ہیں جو عام قارئین اور طلبہ کے لئے بڑے ضروری بھی ہیں۔ امید ہے کہ وہ ان کے مطالعے سے اقبال کے فلسفۂ خودی کے بنیادی موضوعات کو بخوبی سمجھ جائیں گے یہی اس کا مقصد بھی ہے۔

اقبال کے نزدیک شاعری کا مقصد یہ ہے کہ اس کا تعلق زندگی سے ہو اور شاعری زندگی کی رو تیز کرنے میں ممد و معاون ہو سکے۔ اقبال اس وجہ سے فارسی سے زیادہ عربی شاعری کو زیادہ قابلِ توجہ سمجھتے ہیں، کیوں کہ وہ ان کے معیار پر پوری اترتی ہے۔

فکرِ صالح در ادب می بایدت،
رجعتے سوئے عرب می بایدت

مقاصد کی آرزو انسان کی حیوانی فطرت کے علاوہ اس کی اجتماعی فطرت کا حصہ ہے۔ وہ اس اجتماعی حس سے فردِ واحد کی حد تک مستفید ہوتا ہے، اور اس کو ہونا بھی چاہئے۔ انسان نائبِ حق ہے۔ اور اس کے اندر کم و بیش حقانی صفات ہونی چاہئیں۔ اور صالح قوت نمو بھی،

خودی

علامہ اقبال نے ہمیں ایک اہم نظریہ دیا ہے ـــــ یعنی نظریۂ خودی۔ اس نظریے یا خیال کی تشریح اُن کی اکثر کتابوں میں ہے، مگر فارسی کی مثنوی "اسرارِ خودی" میں انہوں نے اس کے ضروری مسئلوں پر خاص طور سے بحث کی ہے۔

خودی فارسی زبان کا لفظ ہے، لغات میں اس کے معنی تکبّر، غرور وغیرہ بھی بتائے گئے ہیں، مگر علامہ اقبال کے کلام میں اس کے معنی اور ہیں۔ آسان لفظوں میں اس کے معنی ہیں خود کا یعنی اپنی ذات، اپنی ہستی یا اپنے وجود کا احساس یا اپنی صلاحیتوں کا خود کو علم وغیرہ وغیرہ۔ اس کے معنی اپنے آپ کو پہچاننا بھی ہو سکتے ہیں، اس سے مراد یہ نہیں کہ کوئی شخص یہ جان لے کہ وہ کس کا بیٹا پوتا ہے اور کس شہر کا رہنے والا ہے۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ وہ یہ بھی جانتا ہو کہ اسے خدا نے کیا کیا قابلیتیں عطا کی ہیں اور وہ اُن سے کیا کام لے سکتا ہے اور ان کی مدد سے اپنی اور اپنی قوم کی، بلکہ سارے انسانوں کی ترقی اور راحت کے لئے کیا کارنامے انجام دے سکتا ہے

یہ سب کچھ تب ہی ہو سکتا ہے کہ انسان کو اپنی پہچان ہو یعنی اپنے اوپر بھروسہ ہو ـــــ اسی کو علامہ اقبال خودی کہہ رہے ہیں۔ یہ

اس لفظ کی آسان تشریح ہے، ورنہ اس کی علمی بحث خاصی مشکل ہے۔ جس کی اس کتاب میں گنجائش نہیں۔

غرض یہ کہ خودی کے معنی ہیں خود کو پہچاننا اور پہچان کر عمل اور محنت کے ذریعے بڑے مقاصد کی تکمیل۔ یہ مقاصد ذاتی بھی ہو سکتے ہیں، مگر چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے (اور مسلمان کو تو اشرف ہی نہیں، اشرف ترین ہونا چاہیئے) اشرف انسان اپنی ذات سے زیادہ اپنی قوم کے لئے اور ساری انسانی برادری کے لئے سوچتا ہے، اس لئے اقبال کے نزدیک بڑے مقاصد وہی ہوں گے، جو قومی ہوں گے۔ پس خودی اس خودشناسی کا نام ہے جو مقاصد کی لگن میں عمل پر اُبھارے اور یہ عمل ایسا ہو جو ذات کے ساتھ ساتھ ملّت[1] کی ترقی اور سربلندی میں امداد دے۔

اس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ علامہ اقبال کے کلام میں خودی کے خاص معنی ہیں۔ علامہ اقبال سے پہلے، صوفی شاعروں نے بھی "خود کو پہچاننے" پر زور دیا ہے۔ چنانچہ مشہور مقولہ ہے: "جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے گویا خدا کو پہچان لیا[2]!" مگر صوفیوں کا مطلب جدا ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ انسان یہ سمجھ لے کہ انسان اپنی اصل میں خدا سے جدا نہیں۔ انسان کی روح خدا کی مقدس ذات (روحِ کلی) سے ملی ہوئی ہے گویا خدا کائنات اور انسان اصل

۱۔ ملّت سے مراد قوم۔ مگر ملّت خاص استعمال میں، وہ تمام ہم عقیدہ برادری ہے جو ابراہیم علیہ السلام سے رشتہ جوڑتی ہے۔

۲۔ من عرف نفسہ، فقد عرف ربّہٗ

میں ایک ہیں۔ ان کو ہم ایک دوسرے سے جدا نہیں سمجھ سکتے۔ مگر اقبال یوں نہیں سوچتے۔ اقبال یہ کہتے ہیں، کہ انسان جو کچھ بھی ہے، اپنے موجودہ حالات میں خدا سے الگ وجود رکھتا ہے۔ اس کی ترقی (یعنی خدائی صفات۔ بلندی، غلبہ، عدل وغیرہ) کا ظہور اس پر منحصر ہے کہ وہ کوشش کرے اور دوسرے انسانوں کے تعاون سے اونچے سے اونچے درجے حاصل کرتا جائے۔

صوفی نفس (خود کو) مار کر پھر اپنی اصل (خدا) تک پہنچنا چاہتے ہیں اقبال خود کو تسلیم کر کے، خود کی اندرونی قابلیتوں کو بڑھانا چاہتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ اقبال کی خودی، اور صوفیوں کی خودشناسی میں بڑا فرق ہے۔

اسرارِ خودی

علامہ اقبال نے خودی کے مسائل کا مربوط طریقے سے بیان سب سے پہلے اپنی فارسی مثنوی اسرارِ خودی میں کیا ہے - یہ مثنوی تقریباً ۱۹۱۲ء میں لکھنی شروع کی گئی تھی - اور ۱۹۱۵ء میں پہلی بار چھپی -

چونکہ خودی کا اصل تخیل اسی کتاب میں ہے اس لئے اس کے مطالب کا خلاصہ بہت سے ایسے لوگوں کے لئے مفید رہے گا جو اقبال کے خیالات سے اچھی طرح آگاہ نہیں -

شروع میں اقبال نے اپنی شاعری کی خاص نوعیت کا ذکر کیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ میں مولانا روم کے کلام سے متاثر ہوا ہوں - مولانا روم ہی نے مجھے سمجھایا ہے کہ نئی طرح کی شاعری کی ضرورت ہے ، یعنی ایسی شاعری جو قوموں کو زندہ کر دے

نالہ را انداز نو ایجاد کن
بزم را از ہائے و ہو آباد کن

ترجمہ: اپنی شاعری (فریاد) کے لئے نیا انداز پیدا کر اور بزم کو (دنیا کو) اپنے جوش انگیز کلام سے گرما دے -

اقبال فرماتے ہیں کہ اس مثنوی سے میرا مقصد وہ شاعری نہیں جو عام طور سے مروج ہے بلکہ میں تو اس کے ذریعے خودی کے راز ظاہر کرنا چاہتا ہوں -

اس کے بعد یہ بحث کی ہے کہ نظام عالم خودی کی وجہ سے ہے ، اور

زندگی اور وجود کا تسلسل خودی کے استحکام پر منحصر ہے:

چوں حیات عالم از روز خودی است
پس بقدرِ استواری زندگی است

ترجمہ: چونکہ دنیا کا وجود خودی کی بدولت ہے اس لئے زندگی کی قسمت اور بقا استواری اور محکمی کی نسبت سے ہوگی۔

خودی کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ خود کو ظاہر کرنے پر مجبور ہے۔ وہ خود ایک خاموش قوت ہے مگر عمل کے لئے بیتاب ہے:

وا نمودن خویش را خوے خودی است
خفتہ در ہر ذرہ نیروی خودی است

ترجمہ: خود کو ظاہر کرنا خودی کی عادت ہے۔ خودی کی تخم ہر ہر ذرہ کے اندر چھپی ہوئی ہے۔

اس کے بعد علامہ اقبال نے یہ بیان کیا ہے کہ خودی، مقاصد کے ہونے اور پیدا کرنے پر موقوف ہے۔ یعنی خودی کے احساس و قوت کے لئے بڑے بڑے مقاصد کا ہونا ضروری ہے:

زندگانی را بقا از مدعاست کاروانش را درا از مدعاست

ترجمہ: زندگی مدعا اور مقصد سے قائم ہے۔ زندگی کے قافلے کو جگانے والی اور چونکانے والی چیز منزل اور مقصد کا خیال ہے جس طرح درا کی آواز قافلوں کو جگاتی اور بڑھنے کا پیغام دیتی ہے اسی طرح مقصد و مدعا زندگی کو بڑھنے پر آمادہ کرتا ہے۔

یہ مقصد و مدعا کیا ہے؟ آرزو کی وہ آخری منزل جسے انسان اپنے لیے ضروری اور باعثِ مسرت خیال کرتا ہے۔ یہ آرزو انسان کو جستجو پر آمادہ کرتی ہے:

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است

ترجمہ: زندگی کا راز جستجو میں ہے اور جستجو آرزو کے اندر جنم لیتی ہے۔

اقبال فرماتے ہیں کہ ہم اپنی آرزوؤں کی بدولت زندہ ہیں۔ آرزوؤں کے پیدا ہونے اور ان کے لئے سرگرم عمل ہونے ہی میں زندگی ہے:

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم — از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

اس کے بعد علامہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوتی ہے۔ یہاں علامہ خودی کو ایک "نقطۂ نور" قرار دیتے ہیں جو ہمارے اس خاکی وجود میں زندگی کی چنگاری سلگائے رکھتا ہے۔ اس نقطۂ نور کی یہ خاصیت ہے کہ عشق و محبت سے اس کی گرمی، چمک اور قوت اور زیادہ ہوتی ہے۔ یہ محبت بڑی وسیع چیز ہے، انسان سے لے کر حضرت مصطفیٰ ﷺ اور خدا تک اور عام لگن سے لیکر بڑے بڑے مقاصد کے عشق تک محبت کی دنیا پھیلی ہوئی ہے ——— اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے تو عشقِ مصطفیٰ ﷺ سے بڑھ کر اور کیا چیز ہوگی۔ اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی لازمی شرط تقلیدِ مصطفیٰ ﷺ (آنحضرت ﷺ کی پیروی) ہے۔ اقبال فرماتے ہیں: اگر تم سچ مچ عاشقِ مصطفیٰ ﷺ ہو تو آپ ﷺ کی تقلید کرو تاکہ تمہاری کمند یزداں تک کو شکار کر سکے!

عاشقی محکم شواز تقلیدِ یار
تا کمند تو شود یزداں شکار

خودی کا وصفِ خاص یہ ہے کہ یہ خود پر بھروسہ کرتی ہے اور دوسروں سے مانگنے اور سوال کرنے سے اسے نفرت ہے۔ سوال سے خودی ضعیف ہو جاتی ہے۔

جب خودی عشق و محبت سے محکم ہو جاتی ہے تو نظامِ عالم کی ظاہری اور مخفی قوتوں کو مسخر کر لیتی ہے۔

جو قومیں خودی کا انکار کرتی ہیں اور وجود کو محض طلسم اور عکس کہتی ہیں وہ دراصل خود کمزور ہوتی ہیں اور اس طرح کا خیال اس لئے پھیلاتی ہیں کہ غالب اقوام بھی اس طرح سوچنے لگیں اور انہی کی طرح کمزور ہو جائیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ شیروں کو کوئی یہ سبق سکھائے کہ خونخواری بری چیز ہے اور نیک لوگ وہ ہیں جو گھاس پر گزارہ کرتے ہیں:

روحِ نیکاں از علف یابد غذا
تارکُ اللحم است مقبولِ خدا

ترجمہ: نیک لوگ گھاس وغیرہ سے پیٹ پالتے ہیں، جو لوگ گوشت کھانے سے پرہیز کرتے ہیں خدا کے مقبول بندے وہی ہیں۔

اقبال نے لکھا ہے کہ پرانے فلسفیوں میں سے (یونانی حکیم) افلاطون کے خیالات بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔ مسلمانوں نے عہدِ ماضی میں اس کا خاص اثر قبول کیا ہے اور انہیں اس سے بہت نقصان پہنچا ہے اور آئندہ بھی اس سے نقصان کا

اندیشہ ہے، اس لئے اس کے خیالات سے بچنا چاہئے۔ اقبال نے افلاطون کو "انسان کے لباس میں گوسفند" قرار دیا ہے۔ اقبال کی شکایت یہ ہے کہ افلاطون وجود کو حقیقی نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ اصل حقیقت کہیں عالم بالا پر ہے ہم اس کا عکس دیکھ رہے ہیں۔ یہ دنیا عکس ہے، سایہ ہے، کسی غار میں بیٹھا ہوا آدمی جس طرح دور کسی راستے پر کسی کارواں کا سایہ دیکھ رہا ہو۔

افلاطون کے ان خیالات کا اثر مسلمانوں کے ادب اور شاعری پر خاصہ گہرا ہے۔ اقبال ایک باب میں شعر و شاعری کی حقیقت اور ادبیات اسلامیہ کی اصلاح کی ضرورت جتلاتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ واضح کرتے ہیں کہ شاعر کا سینہ، حُسن کی تجلیات کا مرکز ہوتا ہے۔ اس کی نگاہ سے خوبصورت زیادہ خوبصورت معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس کا دل سوز کا منبع ہوتا ہے اس لئے اس کی آواز اوروں کو بھی گرما دیتی ہے۔ گویا شاعر کا اصل کام زندگی کی آرزو بڑھانا ہے۔

لیکن بعض شاعر ایسے بھی ہوتے ہیں جو زندگی کی اس آرزو کو گھٹاتے ہیں ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جن سے مایوسی پیدا ہو اور دل مر جائیں۔ فارسی و اردو شاعری کا ایک حصہ ایسا ہی ہے۔

بنا بریں اقبال شاعروں کو تلقین کرتے ہیں کہ انہیں ایسی شاعری کرنی چاہئے، جس کا تعلق زندگی سے ہو یعنی وہ زندگی کی آرزو کو تیز کرے۔ ان کے نزدیک فارسی سے زیادہ عربی شاعری قابلِ توجہ ہے:

فکر صالح در ادب می باید
رجعتے سوئے عرب می باید

ترجمہ: ادب کے لئے فکر صالح لازم ہے اور اس کے لئے عربی شاعری کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

ان بحثوں کے بعد اقبال تربیتِ خودی کے تین مراحل کا ذکر کرتے ہیں۔ اوّل اطاعت، دوم ضبطِ نفس اور سوم نیابتِ الٰہی۔

اقبال کے نزدیک سچی آزادی، اطاعت یعنی پابندیٔ فرائض سے پیدا ہوتی ہے، اور مسلمان ہونے کی صورت میں آئینِ مصطفیٰ کی اطاعت جملہ مراحلِ ترقی کا پہلا قدم ہے:

شکوہ سنج سختی آئیں مشو
از حدودِ مصطفیٰ بیروں مشو

ترجمہ: آئین کی پابندی میں جو تکلیف ہے اس کی شکایت نہ کر، اور آنحضرتؐ نے زندگی کی جو حدیں قائم کی ہیں ان کے اندر رہنے کی کوشش کر۔

ضبطِ نفس سے مراد یہ ہے کہ زندگی کی ترغیبات میں نفس اور خواہش کو قابو میں رکھا جائے۔ خوفِ دنیا اور حبِ دنیا دونوں کی باگ ایمان کے ہاتھ میں ہو۔

نفس تو مثل شتر خود پرور است
خود پرست و خود سوار و خود سر است
مرد شو آور زمامِ او بکف
تا شوی گوہر اگر باشی خزف

ترجمہ : تمہارا نفس اونٹ کی مانند خود پرور واقع ہوا ہے۔ اسے ہر وقت اپنا اور اپنے تن کا خیال رہتا ہے۔ یہ تو تمہارا فرض ہے کہ تم اس کی باگ مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں رکھو۔ بس اسی صورت میں تم کمال کو پا سکو گے۔ اگر تم خزف بھی ہو تو بھی گوہر بن سکتے ہو۔

غرض محبت اور خوف دونوں قسم کے جذبوں پر قابو پانے کی ضرورت ہے۔ اور اسلام کے احکام پر عمل سے یہ چیز مکمل ہو جاتی ہے۔ توحید پر ایمان لانے سے خدا کے سوا کسی چیز کا خوف نہیں رہتا۔ حج مسلمانوں کو یہ بتاتا ہے کہ گھر بار اور وطن کی محبت کو خدا کے لئے کس طرح چھوڑا جا سکتا ہے اسی طرح زکوٰۃ کا حکم اس لئے ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی عادت ہو، اور دولت کی محبت دل میں بیٹھنے نہ پائے :

این کہ اسباب استحکام تست　　پختہ ای محکم اگر اسلام تست
اہلِ قوت شو ز وردِ یا قوی　　تا سوار اشتر خاکی شوی

ترجمہ : یا قوی (قوی۔ قوت والا۔ خدا کے ناموں میں سے ایک نام ہے) کے ورد سے طاقتور اور مضبوط بن جا، تاکہ اونٹ (اشتر خاکی : بدن کو اونٹ کہہ کر اس مماثلت کو زیادہ واضح کیا ہے جس سے اس باب کا آغاز ہوا ہے۔) کو مضبوطی سے اپنے قابو میں کر سکو۔ اپنی جبلتوں (خوف اور محبت) کو ایمان کے تابع کر سکو۔

اقبال نے اونٹ کی تشبیہ کو نیابت الٰہی کی تشریح میں اور بھی آگے بڑھایا ہے اور لکھا ہے :

گر شتر بانی جہاں بانی کنی
زیب سر تاجِ سلیمانی کنی

ترجمہ : اگر تم اونٹ پر جم کر سواری کرنے اور اس کو قابو میں رکھنے کے قابل ہو جاؤ تو تم بادشاہی کے لائق اور سزاوار بن جاؤ گے۔

یہاں اونٹ چرانا استعارہ ہے۔ اصل مقصود یہ کہ اگر انسان خواہشاتِ تن پر قابو پالے تو پھر اسے وہ کمال اور طاقت مل سکتی ہے جو اسے بادشاہی کے لائق بنا سکتی ہے۔

ایسا ہی انسان نائبِ حق کہلانے کا حقدار ہے۔ یہ نائبِ حق اپنے ان کمالات کی وجہ سے عناصر پر (اس کائنات پر) حکمرانی کر سکتا ہے۔ اس کی ہستی اسمِ اعظم کا عکس ہوتی ہے وہ جز اور کل کی رموز سے آگاہ ہوتا ہے۔ وہ نوعِ انسان کے لئے بشیر بھی ہوتا ہے اور نذیر بھی۔ اور اس کے ہاتھ سے ایسے ایسے کمالات ظاہر ہوتے ہیں جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

اقبال نائبِ حق کے اوصاف کی مزید تشریح، حضرت علیؓ کے مختلف ناموں کے ضمن میں کرتے ہیں۔ بوتراب[1]، یداللہ، باب مدینۃ العلم ان ناموں میں وہ اوصاف پائے جاتے ہیں جو مردِ حق سے مخصوص ہیں۔ مثلاً بہادری اور سخت کوشی، خودداری اور مشکل پسندی ــــ، اسی طرح مردِ حق کی ایک خصوصیت زندگی میں انقلاب لانا اور غلبہ پانا بھی ہے۔ وہ قوت اور استیلا کا ذوق رکھتا ہے

۱۔ بوتراب ۔ مٹی کا باپ ۔ یہ حضرت علیؓ کی کنیت ہے۔

اور بے ہمتی کا سخت دشمن ہوتا ہے ۔ اور وہ ان خصائص سے پاک ہوتا ہے جو کسی دوسری وجہ سے نیکیوں میں شمار کر لی گئی ہیں ۔ حالانکہ وہ ضعف اور کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہیں ۔ مثلاً غصہ بے جا کو نیکی سمجھ لیا گیا ہے ۔ ناتوانی کا نام قناعت رکھ لیا گیا ہے ۔ رحم، نرمی اور انکسار یہ سب تن آسانی کی شکلیں ہیں ——— فضیلتیں نہیں ۔ اور فضیلت کیا ہے ؟ ———

باتوانائی صداقت توأم است
گر خود آگاہی ہمیں جام جم است

ترجمہ : طاقت اور سچائی دونوں ایک دوسرے سے یوں وابستہ ہیں جیسے دو جڑواں بچے باہم ملے ہوئے ہوتے ہیں .... گویا قوت اصل شے ہے ۔ اور یہ سچائی کے ساتھ ساتھ چلنے والی ایک فضیلت ہے ۔

کہتے ہیں کہ حضرت داتا گنج بخشؒ کی خدمت میں مرو کا ایک نوجوان حاضر ہوا اور شکایت کی کہ میرا ایک دشمن میرے پیچھے لگا ہوا ہے ، دعا فرمایئے ۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا ۔ اس کے خوف سے خود کو آزاد کر لو ۔ جب تم میں یہ بے خوفی پیدا ہو جائے گی تو وہ خود بخود مغلوب ہو جائے گا ۔

اقبال نے ایک اور تمثیل بھی لکھی ہے ایک پرندہ ریزۂ الماس کو شبنم (یا پانی) کا قطرہ سمجھ بیٹھا اور اس سے چونچ کو تر کرنے لگا ۔ الماس بولا ! تم کیسے بھولے بھالے پرندے ہو ۔ میں شبنم نہیں الماس ہوں ۔ اگر شبنم ہوتا تو اپنی نرمی اور ملائمت کی وجہ سے تمہاری ایک چونچ سے فنا ہو چکا ہوتا ———

میری پختگی نے مجھے محفوظ رکھا ہے

ریزۂ الماس شو شبنم مشو

ترجمہ: شبنم مت بن ریزۂ الماس بن (تاکہ آفات سے محفوظ رہو)۔

ایک اور مثال کوئلے اور الماس کی دی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ الماس اپنی پختگی کی وجہ سے آب و تاب کا مالک بن گیا اور کوئلہ اس سے محروم رہا۔ نتیجہ ظاہر ہے:

در سلامت آبروئے زندگی است
ناتوانی نا کسی ناپختگی است

ترجمہ: مضبوطی اور پختگی سے زندگی کی آبرو قائم ہے۔ اور ناپختگی گویا ناتوانی اور نالائقی کا دوسرا نام ہے۔

اس سلسلے میں یہ یاد رہے کہ مسلم کی یہ قوت اور پختگی اس لئے نہیں سراہی گئی کہ اس سے وہ کوئی ذاتی فائدہ حاصل کرتا ہے، بلکہ وہ اپنی اس قوت کو اشاعتِ توحید میں صرف کرتا ہے۔ اسی کا نام جہاد ہے اور جہاد کا مقصد دوسرے ملکوں کو خواہ مخواہ فتح کرنے کی لڑائی نہیں بلکہ کلمۂ حق کی اشاعت کے لئے ہے۔ محض ملک گیری کی ہوس (جوعُ الارض - زمین کی بھوک) اس کا مقصد نہیں۔

جہاد دراصل ایک قومی فریضہ ہے، اس کا تعلق ملت سے ہے۔ اس لئے فرد اور ملت کا تعلق پہچاننا ضروری ہے مگر یہ بحث الگ آئے گی۔

خودی کا سلسلۂ عمل

(۱) تخلیقِ مقاصد

خودی کا جوہر فطرتاً ہر شے میں (کائنات کی ہر شے میں) موجود ہے اور اسکی ترقی کے وسائل بھی ہر شے کو عطا ہوتے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر شے خود بخود بڑھتی جاتی ہے۔ جہاں خودی قوی ہو کر ارتقا کا باعث بن سکتی ہے وہاں یہ بھی ہوتا ہے کہ خودی بعض اسباب سے ضعیف ہو کر مر بھی جاتی ہے۔

نیچر کی حد تک اس کے جو اسباب بیان کئے گئے ہیں ان کی تشریح ارتقا کی کتابوں میں مل سکتی ہے۔ البتہ انسانوں کے معاملے میں، خودی کے ضعف و استحکام کی گفتگو یہاں برمحل بلکہ ضروری ہے۔

خودی کا عمل تخلیقِ مقاصد سے وابستہ ہے — یعنی اعلیٰ مقاصدِ حیات کی آرزو اور ان کے لئے جدوجہد خودی کا خلاصہ ہے۔ نیچر کی حد تک یہ مقاصد، خود نیچر کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔ انسان بھی نیچر سے آزاد نہیں مگر اس کے عمل کی حدیں بہت وسیع ہیں کیونکہ اس کی صلاحیتیں خصوصاً حرکت قوت اور تجزیے اور تنظیمِ نو کی صلاحیت انسان سے مخصوص ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اعلیٰ مقاصدِ حیات کی آرزو، قلبِ انسانی میں پیدا کیوں ہوتی ہے؟ اس کے کئی جواب ہیں۔ یہ آرزو دو طرح یا دو وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

(الف) اس قدرتی جوشِ حیات سے جو کائنات کے ذرے ذرے میں

نظر آرہا ہے۔ جو بیج سے درخت بناتا اور گل پھول لگاتا رہتا ہے اور نسل و نوع کو بڑھاتا رہتا ہے۔ یہ محرکِ فطری ہے۔ اسے اقبال کے قول کے مطابق نقطۂ نوری کہہ ڈالیے یا برگساں کے خیال کے مطابق جوشِ حیات کہہ دیجئے، یہ عطیۂ ربانی ہے جو ہر شے کو عطا ہوا ہے۔ یہ آرزو کا منبعِ اوّل ہے، اقبال کے کلام میں عشق بھی اسی کا نام ہے۔

(ب) دوسری شے جو آرزو کی خالق اور اس کو تقویت دینے والی ہے وہ انسان کا یہ احساس ہے کہ دنیا میں اس کے ہمسر اور بھی ہیں۔ ان سے فائق ہونے یا اُن میں فائق ہونے کا جذبہ انسان کا ایک بنیادی جذبہ ہے۔ میگڈوگل نے انسانی جبلّتوں کی جو فہرست تیار کی ہے اس میں غلبہ پانے کی جبلّت بھی شامل ہے۔ یہ جبلّت اپنی ابتدا میں فوقیت حاصل کرنے کے میلان کی شکل اختیار کرتی ہے ——— یہ جبلّت انفرادی ہونے کے باوجود دراصل اجتماع سے وابستہ ہے۔ دوسرے انسان نہ ہوں تو فوقیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(ج) محض ٹکراؤ سے بھی ایک احساس پیدا ہوتا ہے (جسے پیکار کہا گیا ہے) مگر محض ٹکراؤ نچلی درجے کی زندگی کی خاصیت ہے، انسانی درجے میں فوقیت کا جذبہ مؤثر ترین محرک ہے۔ برتر انسانوں کے ٹکراؤ کے لئے جو ایک شعوری اور اخلاقی میلان ہے ذوقِ تسخیر کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ یہ جذبہ اپنی انتہا کے اعتبار سے معیوب بھی نہیں۔ اور اس کے سلسلے میں جو پیکار لازمی ہو جاتی ہے اس میں تالیف، توافق اور عادلانہ جارحیت تینوں شامل ہیں، تغلب یا میلانِ ظلم میں شامل نہیں، انسان ایک با اقدار مخلوق ہے۔ نیچر کی طرح بے اقدار نہیں

یعنی تجربات کی نچلی سطحوں کے لئے دیئے گئے قانون پر بے رحمانہ عمل کرتی ہے۔ انسان کا عمل بے رحمانہ نہیں رہتا یہ با مقصد ضرور رہتا ہے مگر بے رحمانہ نہیں منظم ہے مگر ظالمانہ نہیں۔

خلاصہ یہ کہ مقاصد کی آرزو انسان کی حیوانی فطرت کے علاوہ اس کی اجتماعی فطرت کا حصہ ہے۔ وہ اس اجتماعی حس سے فردِ واحد کی حد تک بھی مستفید ہوتا ہے اور جماعتی دائرے میں اور جماعتی مقاصد کی صورت میں بھی ہوتا ہے۔ اور جماعت اپنے مقاصد اپنے ماحول سے حاصل کرتی ہے۔

یہ حس قوی بھی ہو سکتی ہے اور کمزور بھی —— اسی طرح یہ حس اگرچہ جبلی اور فطری ہوتی ہے مگر ارادے اور شعور سے اس کے استحکام کی صورتیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ اور استحکام کے ساتھ اس کی راہیں بھی متعین کی جا سکتی ہیں۔ یہیں سے تعلیم اور تربیت کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے جو خودی کے استحکام اور اس کو عادلانہ عمل کی طرف لے جا سکتی ہے۔

خودی کا سرچشمہ عمل

(۲) عشق

گذشتہ بحث میں بیان ہو چکا ہے کہ خودی کا عمل، آرزو (عشق یا مقاصد کی لگن) کا محتاج ہے۔ خودی میں زندگی کو ترقی دینے کی جو صلاحیت ہے اس کی محرک یہی آرزو ہوتی ہے ـــــ آرزو کی تکمیل کے عمل میں خودی کو رکاوٹوں سے برسرِ پیکار ہونا پڑتا ہے اور اس پیکار میں قوت بخشنے والی شے عشق ہے، عشق!

اس کا مطلب یہ ہوا کہ پیکار ترقی کے لئے محض وسیلہ ہے مقصود بالذات نہیں، اس کے مقابلے میں خودی کا جوہر عشق ہے اور یہ ایک مثبت قوت ہے جو مزاحمتوں کا مقابلہ کرتی ہے اور آگے بڑھ جاتی ہے! ـــــ یہ عشق کیا شے ہے؟ اسکی تفصیل لازمی ہے۔

عشق اس جذبے کو کہتے ہیں جو طالب کو مطلوب کی طرف کھینچتا ہے۔ یہ اس کے سرسری معنی ہیں۔ مگر اس جذبے کی ماہیت اور تاثیر کے بارے میں کئی تعبیریں بیان کی گئی ہیں ان سب تعبیروں کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ عام سائنسی نقطۂ نظر سے، عشق، زندگی کو بڑھانے (یا بقائے نوع) کا ایک ذریعہ ہے۔ نر اور مادہ کی باہمی کشش کا نتیجہ وصال ـــــ اور اس کا نتیجہ تولید! یہ بیالوجی یا حیاتیات والوں کی تفسیر ہے۔

۲۔ ڈارون کے نزدیک، میلان بقاء ارتقا کا نام عشق ہے۔
۳۔ صوفیوں کے نزدیک عام معنوں کے علاوہ، محبوبِ حقیقی سے محبّت
——— اور اسکی خاطر ہر شے سے محبت۔
۴۔ افلاطون کے یہاں عشق مطلق کا تصور پایا جاتا ہے، اس کے نزدیک
باقی سب محبتیں مجازی ہیں، اصل چیز جو سرمدی یعنی ازلی ابدی ہے
یہی مطلق عشق ہے۔
۵۔ فرائڈ (جو تحلیلِ نفسی کا امام ہے) کہتا ہے کہ زندگی کی دو قوتیں بنیادی
ہیں۔ ایک تخریبی قوت جس کا دوسرا نام موت ہے۔ دوسری تعمیری قوت
جس کا دوسرا نام عشق ہے۔ یہ دوسری قوت مرد و زن کی کشش
سے شروع ہو کر، تمام نوعِ انسان تک ترقی کر جاتی ہے۔
(تفصیل ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی کتاب "فکرِ اقبال" ص ۴۰۴)
۶۔ عشق آرزو کا خالق جذبہ ہے اور آرزو کا وسیلہ بھی ہے اور نتیجہ بھی،
صوفیوں کے نزدیک، عشق ایک تاثراتی یا جذباتی معاملہ ہے۔
حکماء کے نزدیک نظریاتی مسئلہ ہے۔
اقبال چونکہ رومی کے خیالات سے بہت متاثر ہیں، اور وہ ایک صوفی بزرگ
تھے، اس لئے صوفیوں کے تصورِ عشق کی گفتگو اگر زیادہ پھیل بھی جائے تو مضائقہ
نہیں۔

صوفیوں کا منتہائے مقصود وصالِ حقیقی ہے یعنی خدا تک پہنچنا اور اس
میں جذب ہو جانا ——— صوفی کے مسلک میں یہ سفر بڑا صبر آزما اور طویل ہے۔

مگر وہ جذبۂ عشق کی مدد سے ان سب مشکلات پر قابو پا لیتا ہے۔

صوفی کا یہ جذبۂ عشق عجیب و غریب چیز ہے۔ یہ کوئی اندھی بہری قوت نہیں، یہ جہاں صوفی کے لئے لذت بخش اور مسرت آفریں ہے اور اس مسرت بخشی کے ذریعے اسے مشکلات سے پیکار پر اُبھارتی ہے، وہاں یہ بصیرت کا سرچشمہ بھی ہے (cognitive)۔ صوفی، جب عشق کی منزلوں میں وجد و حال کی کیفیت سے لذت یاب ہوتا ہے تو ان حالتوں میں بسا اوقات اس پر علم کے دروازے بھی کھل جاتے ہیں۔ یہ علم، عقل کی مدد سے حاصل کئے ہوئے علم سے زیادہ یقینی اور قطعی ہوتا ہے۔

خودی کے سلسلۂ عمل میں مقاصد کی لگن (عشق) بھی ایک اہم چیز ہے یہ مزاحمتوں کے مقابلے میں حوصلہ اور اگلی منزلوں کے لئے علم و بصیرت پیدا کرنے والی رہنما قوت ہے۔ یعنی یہ علم بھی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی عمل کی محرک بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ عقل کی مدد سے حاصل کئے ہوئے علم میں یہ کمال نہیں ہوتا کہ خود ہی علم بھی ہو اور عمل بھی ـــــ وہ تو دور سے بیٹھ کر اشارے کرنے والا رہنما ہوتا ہے ـــــ اور بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے اشارے غلط ہوتے ہیں کیونکہ اس کا سارا سرمایہ نتائج، قیاس پر مبنی ہوتا ہے اور قیاس بعض اوقات غلطی بھی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیوں کے کلام میں (اور خود اقبال کے کلام میں)، عشق کو عقل اور عمل دونوں پر فضیلت دی گئی ہے (عقل و عشق باہمی کے مقابلے کی مزید بحث عقل و علم کے عنوان میں آئے گی)۔

یہاں بحث خودی کے سلسلۂ عمل کی ہو رہی ہے اور اس سلسلۂ عمل میں عشق ایک بنیادی اور ترقی دینے والا جذبہ ہے۔ اس لئے یہ ذہن نشین کرنا لازمی ہے کہ عشق کے جو معنی بھی لئے جائیں ان میں سے ہر ایک خودی کے سلسلۂ عمل میں مفید ہے۔ خودی کا عشق سے اتنا گہرا اور قریبی تعلق ثابت ہوتا ہے کہ بعض اوقات یہ گمان گذرتا ہے کہ خودی اور عشق دونوں ایک ہی شے کے دو نام ہیں چنانچہ اقبال نے خود بھی بعض موقعوں پر یہی لکھا ہے۔

عشق کی صفات گوناگوں ہیں۔ عشق کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اسے خطرات کی پرواہ نہیں ہوتی۔ اس کی دوسری سرشت بے غرضی ہے یعنی مقصدِ اعلیٰ کے سوا جو خود ایک پاکیزہ نصب العین ہوتا ہے، کوئی مادی یا جسمانی غرض نہیں ہوتی (اسی لئے اقبال نے عشق اور فقر کو لازم و ملزوم ٹھہرایا ہے ___ فقر سے مراد یہ ہے کہ سب کچھ میسر ہونے کے باوجود اور ہر مادی شے پر قادر ہونے کے باوجود ہر شے سے بے نیازی ہو)۔

عشق کی خاصیت یہ بھی ہے کہ خود علم ہوتا ہے۔ (جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے)۔ وہ عقلی علم کا دشمن نہیں، مگر اس کا محتاج نہیں ہوتا۔ البتہ عقلی علم۔ اگر عشق کا رفیق بن جائے تو یہ بھی خودی (زندگی کی ترقی کی آرزو اور جد و جہد) کے لئے بہت مبارک بات ہے۔

زیرکی از عشق گردد حق شناس ‏ ‏ ‏ کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہم بر شود ‏ ‏ ‏ نقشبندِ عالمِ دیگر شود
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ ‏ ‏ ‏ عشق را با زیرکی آمیز دہ

یعنی زیرکی (عقلی علم) اگر عشق سے فیضیاب ہو جائے تو اس میں حق شناسی کا جوہر پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح عقلی علم سے عشق کو بھی تقویت مل سکتی ہے۔

اس سے عشق کی ایک اور خاصیت کا پتہ چلا ـــــ اور وہ ہے، سچائی (حق) کی نگہداشت۔ اور حکمار عموماً یہ کہتے ہیں کہ حق، خیر اور حسن ایک ہی قدرِ مطلق کے تین الگ الگ نام ہیں۔ جہاں حق ہے وہاں خیر اور حسن بھی ہے۔

اس سے یہ ظاہر ہوا کہ عشق، صرف حسن ہی کا آرزومند نہیں بلکہ نیکی اور سچائی کا بھی طلب گار ہے۔ قوت کا سرچشمہ بھی ہے اور بصیرت کا منبع بھی، آرزومند تو ہے مگر غیور و بے نیاز اور خوددار بھی ہے۔ خوف اس کی سرشت میں نہیں، خطر طلبی اس کا خاصہ ہے۔ مقاصد کی پیکار میں اسے لذت ملتی ہے، مصالحت اندیشی، شک اور تذبذب سے اسے چڑ ہے۔ وہ آرزو بھی ہے اور علم بھی ـــــ علم بھی ہے اور عقل بھی ـــــ! اتنی ہمہ گیر قوت و صلاحیت کو (جو کائنات کے اندر جگہ پنہاں ہے) اگر حیات اور خودی کا جوہر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اسی وجہ سے قدیم صوفیوں نے اور اقبال نے بھی جا بجا عشق کی برکات کا ذکر کیا ہے۔

خودی کا سلسلۂ عمل

(۳) پیکار

یہ تو معلوم ہو گیا کہ خودی ایک "نقطۂ نوری" ہے جو ہر شے کے اندر موجود ہے۔ اور انسان کے باطن میں بھی موجود ہے۔ مگر اس میں گرمی، چمک اور قوت، آرزو (عشق و محبت) پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ یہ عشق و محبت بڑا وسیع لفظ ہے، بڑے بڑے مقاصد کی لگن بھی اس میں شامل ہے۔ — انہی مقاصد کی لگن سے قوت عمل جاگ اٹھتی ہے اور فرد (اور مجموعی طور پر ملت بھی) بڑے بڑے کارنامے انجام دینے کو بیتاب ہو جاتی ہے۔ اس کے دل سے غیر اللہ کا خوف نکل جاتا ہے اور وہ بے خطر مشکل سے مشکل منزلوں کو عبور کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔

خودی جب کسی آرزو کے تحت سرگرم عمل ہو جاتی ہے تو مقاصد کے حصول کے لئے اسے دو قوتیں آمادہ رکھتی ہیں ایک آرزو یعنی یہی عشق (مقاصد یا ذوق تسخیر) اور دوسری منفی۔ یعنی راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی قوت یا پیکار (یا ذوق ستیز)

مرد خودارے کہ باشد پختہ کار
با مزاج او بہ سازد روزگار
گر نہ سازد با مزاج او جہاں
می شود جنگ آزما با آسماں

برکند بنیادِ موجودات را می دہد ترکیبِ نو ذرات را

یعنی جب فردِ خود آشنا ہو جاتا ہے تو زمانہ خود بخود اس کے مزاج کا ہم رنگ بن جاتا ہے ورنہ وہ زمانے سے ٹکرا جاتا ہے اور ایک نئی دنیا وجود میں لے آتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ خودی کے عمل میں، عشق اور پیکار دونوں کی ایک خاص اہمیت ہے۔ دونوں خودی کے محافظ بھی ہیں اور اسکی ترقی کا ذریعہ بھی۔ عشق کا عمل آگے بڑھنے کے شوق کو تیز کرتا ہے اور پیکار اس پیشقدمی کے دوران پیش آنیوالی رکاوٹوں کو طاقت سے دور کرنے کی کوشش ہے۔

اقبال کے کلام میں ان دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ دونوں کی خودی سے اور دوسری طرف آپس میں بھی لازم و ملزوم کی حیثیت ہے۔ اس لئے ان کی تھوڑی سی تفصیل مفید ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اپنی کتاب فکر اقبال میں لکھتے ہیں:

"زندگی کے ارتقاء کے لئے تصادم اور پیکار ناگزیر ہے یہ پیکار کبھی خارج میں ہوتی ہے اور کبھی باطن میں، کبھی فرد ماحول سے ستیزہ کار ہوتا ہے، اور کبھی افکار باہم ٹکراتے ہیں ..... حیات اور ترقی کا مدار انفس و آفاق کے مسلسل تصادم پر ہے" ص ۳۱۳

اقبال کے کلام میں پیکار کا بار بار ذکر آتا ہے اس سے بعض لوگوں

کے دل میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اقبال جنگ جوئی کی تعلیم دیتے ہیں۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ اقبال صرف یہ کہتے ہیں کہ

۱۔ فطرت کے اندر ہر جگہ پیکار کا عمل جاری ہے۔ فطرت میں ترقی و ارتقاء کا سارا سلسلہ اسی اصول کے تابع ہے۔

۲۔ انسانی تاریخ سے بھی یہی پتہ چلتا ہے۔ تہذیبِ انسانی کی ترقی میں پیکار اور تصادم نے ہمیشہ حصّہ لیا ہے۔

۳۔ مگر اقبال نے ملّتِ اسلامیہ کو ایک برتر ملّت قرار دیکر یہ واضح کیا ہے کہ اس ملّت کا عمل فطرت کے عمل سے برتر اور زیادہ پاکیزہ ہے۔ یہ ملّت پیکار کے فطری اصول پر اونچے مقاصد کی خاطر کچھ پابندیاں عائد کرتی ہے۔

پہلی پابندی یہ ہے کہ پیکار کا یہ سلسلہ صداقت سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ دوسری پابندی یہ ہے کہ اس میں خوفِ حق ہر وقت موجود رہنا چاہیے بے غرضی یعنی ذاتی اغراض سے پاک ہونا یہ بھی ایک بنیادی شرط ہے۔

اسی لئے اس جہاد کو جو ملک گیری کی ہوس کی وجہ سے کیا جائے جہاد نہیں فساد کہا گیا ہے۔ جو پیکار اس قدر پاکیزہ ہو اسے کوئی شخص برا نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ بنی نوعِ انسان کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے تاکہ باطل اور ظلم کی قوتیں غالب نہ آجائیں۔

نیچر بھی قانون پر عمل کرتی ہے مگر نیچر کے قانون میں لچک ہوتی ہے (میں اسے بیرحمی نہیں کہتا مگر بعض لوگ اسے بیرحمی کہتے ہیں) نیچر اندھا دھند

(گو ایک بنے بنائے قاعدے کے تحت) پیکار کا عمل جاری رکھتی ہے۔ مگر انسان کا برتر قانون اپنے اندر ایک لچک بھی رکھتا ہے۔ عدل و رحم دونوں کا پاسدار ہے، اور سچائی اور نیکی کی اقدار پھیلانا اس کا ایک شعوری نتیجہ ہے۔!

یہ تسلیم کہ تمام کائنات میں پیکار کا قدرتی عمل جاری ہے ـــ مگر مردِ حق جس پیکار میں سرگرم ہوتا ہے وہ فطرت کی طرح اندھا دھند نہیں بلکہ اخلاقی نصب العین کے تابع ہے۔ مردِ حق کے پیکار کا ایک مرحلہ جذب و تسخیر ہے۔ یعنی تردد رکھنے بکر جذب و کشش کے ذریعے، غیر کو اپنا لیا جائے۔ اور یہ بھی پیکار کا ایک شعبہ ہے۔ اس کی تفصیل عشق کی تشریح میں آئے گی۔ مقصد یہ کہ اقبال کے نزدیک برتر انسان کے پیکار کی نوعیت فطرت کی پیکار سے برتر اور مختلف ہے۔ اسی لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اقبال محض جنگ و جدل کا شاعر ہے۔ صحیح یوں ہے کہ اقبال ذوقِ تسخیر کا شاعر ہے۔ اور اس تسخیر میں محبت اور استیلا (بمعنی غلبہ) دونوں شامل ہیں۔

تسخیر میں جو پیکار جاری ہے اسکی تشریح فلسفیوں اور سائنس دالوں نے اپنے اپنے طریقے سے کی ہے۔ جرمن فلسفی ہیگل کہتا ہے کہ زندگی ایک سلسلۂ جدل[۱] کا نام ہے۔ اسی جدل سے ترقی کا عمل جاری رہتا ہے۔ ایک شے یا جزئی اپنے مخالف شے سے ٹکراتی ہے۔ اس ٹکراؤ سے ایک نئی جزئی وجود میں آتی ہے۔ پھر یہ نئی شے اپنے ماحول میں مخالف جزئی سے

۱۔ جدل کے معنی بھی لڑائی اور پیکار ہیں۔ ہیگل کے ان تصورات کو جدلیات کہا جاتا ہے۔

کھڑا اور پیدا کرتی ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ زندگی اس پیکار کی بدولت نت نئے روپ اختیار کرتی رہتی ہے۔

یہ تو تھی پیکار کی فلسفیانہ توجیہ ــــ سائنسدانوں میں سے بعض نے اشیاء و اجسام کے مشاہدے اور ان کے خواص کے تجزیئے سے یہ معلوم کیا ہے کہ کائنات میں غیر محسوس طور پر ایک جنگ جاری ہے۔ یہ جنگ اپنی حیات و بقاء کے لیے ہے (تنازع للبقاء)۔ اس جنگ میں جو اجسام زیادہ مضبوط ہیں وہ دوسروں کو (جو نسبتاً کمزور ہیں) مغلوب کر کے یا اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں یا فنا کر دیتے ہیں اور زندہ وہی رہتے ہیں جو زندہ رہنے کی قوت و صلاحیت سب سے زیادہ رکھتے ہیں (بقائے اصلح)

انسان بھی چونکہ فطرت کا ایک جزو ہے اس لئے اس کے اعمال و افعال میں (سرشت میں) مذکورہ بالا فطری اصول یا صلاحیت موجود اور کارفرما ہے۔ لیکن چونکہ انسان ایک برتر مخلوق ہے اور ہزارہا برسوں کے تجربے سے اس نے زندہ رہنے کے لئے فطرت سے بلند تر، کچھ قوانین اور بھی دریافت کئے ہیں یا وضع کر لئے ہیں اس لئے اس کے پیکار کے عمل میں اخلاقی تہذیب انھیں موجود رہتا ہے یا رہنا چاہئے۔ وہ حیوان نہیں، انسان ہے اس لئے اس کے اصولِ پیکار حیوان کے اصول نہیں ہونے چاہئیں۔ اگرچہ اس حیوانی صفت کی موجودگی اس کے لئے لازمی ہے کہ زندگی کیلئے پیکار ایک بنیادی شے ہے یہ اور بات ہے کہ اسکی شکل حیوانی پیکار سے جدا ہو سکتی ہے۔

پیکار اور ابلیس

گذشتہ بحث سے پیکار کی بنیادی اہمیت واضح ہو چکی ہے۔ یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ پیکار کی اہمیت اس میں ہے کہ اس میں مزاحمت و مخالفت کی صورتیں موجود ہوں ـــــ مزاحمت پیکار کی روح ہے۔ جسقدر مزاحمت زیادہ ہوگی پیکار بھی اتنی ہی شدید ہوگی اور اسی نسبت سے خودی کو اپنا جوہر دکھانے اور زندگی کو ترقی دینے کا موقع بھی زیادہ ملے گا۔ یہ ایک ازلی قانون اور فطرت میں ہر جگہ کارفرما ہے۔

خاص انسان کے تعلق میں دینی کتابوں میں (قرآن مجید میں بھی) آدم کے راستے میں مزاحمت پیدا کرنے والے ایک وجود کا ذکر آیا ہے۔ جس کے کئی نام ہیں۔ ابلیس، شیطان، طاغوت وغیرہ۔ ان میں سے اول الذکر زیادہ مشہور ہیں۔ اقبال کے کلام میں بھی ابلیس کو مزاحمت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اور چونکہ ذکر اقبال میں پیکار کی خاص اہمیت ہے۔ اس لئے ابلیس کی بھی بڑی اہمیت ہے۔

ابلیس کون ہے؟ کیا ہے؟ کہاں ہے؟ ان سب سوالوں کے جواب مختلف اہلِ علم نے مختلف دیئے ہیں۔ دینی توجیہات کے مطابق ابلیس ایک باغی فرشتہ ہے جس نے آدمؑ کی فضیلت تسلیم نہ کی اور خدا کی نافرمانی کے جرم میں ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہو گیا۔ آدمؑ

کو جنّت سے نکلوانے والا، گناہ پر آمادہ کرنے والا اور آدمؑ کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر پھسلانے والا ابلیس ہی تھا ـــــ اب وہ ہر لحظہ انسان کے درپہ رہتا اور اسے بہکانے اور گمراہ کرنے کے لئے سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ یہ اس کا مستقل مشغلہ ہے اور انسان کو حکم ہے کہ وہ ہر وقت استغفار پڑھے اور اس کی گمراہیوں سے بچنے کی دعا کرتا رہے۔ گویا انسان کو اپنے حریف سے ہر لحظہ جنگ درپیش ہے۔

فلسفیانہ انداز میں سوچنے والوں نے ابلیس کے وجود سے انکار کرتے ہوئے اسے زندگی کا ایک مظہر بلکہ ایک صفت قرار دیا ہے۔ ابلیس شر کی علامت ہے اور الگ ہستی نہیں بلکہ زندگی میں ہر جگہ خیر کے مقابلے میں مزاحمت پیدا کرنیوالی قوت ہے جو نظامِ عالم کے ایک لازمی جزو کی حیثیت سے خیر ہی کی طرح ناگزیر ہے۔

بعض صوفیوں کے نزدیک ابلیس پکّا موحد تھا، اور یہ مصلحتِ ایزدی تھی کہ اس نے انکار اور استکبار کیا۔

معتزلہ (مسلمانوں کے مشہور عقل پسند گروہ) کے نزدیک یہ تخریب انگیز میلان کا نام ہے چنانچہ خود حدیث میں آیا ہے کہ ہر آدمی کا شیطان اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی لئے محی الدین ابن عربیؒ نے کہا تھا کہ شیطان کی گردن مارنے کی ضرورت نہیں اسے مسلمان بنانے کی ضرورت ہے۔

بہرصورت ابلیس کے بارے میں بے شمار توجیہات ہیں۔ ان میں ہر ایک اس بات کی مؤید ہے کہ ابلیس :

۱۔ مزاحمت کا نمائندہ ہے۔

۲۔ شر کا نمائندہ ہے۔

۳۔ انکار، نفی اور تشکیک کا نمائندہ ہے۔

۴۔ عقل محض کا نمائندہ ہے (خدا سے اس کا مکالمہ (آدمؑ کے باب میں) منطق کی پوری پوری نمائندگی کرتا ہے)۔

بعض حکماء نے اسے مادیت کا نمائندہ بھی قرار دیا ہے اور موجودہ مغرب کے قول و عمل کے نقطۂ نظر سے شاید درست بھی ہے مگر زیادہ وجوہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس کا بڑا کام نفی، تشکیک اور مزاحمت ہے خواہ یہ مزاحمت مادی اسباب سے ہو یا محض فکر و استدلال سے یا تر غیب یا وسوسہ اندازی سے، بہرحال مزاحمت اس کا کام ہے۔

دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں کو ابلیس کے کردار میں کشش محسوس ہوئی ہے چنانچہ قدیم اطالوی شاعر ڈانٹے نے اپنی کتاب ڈیوائن کامیڈی میں، انگریز شاعر ملٹن نے اپنی نظم Paradise Lost میں اور جرمن شاعر گوئٹے نے اپنے منظوم ڈرامے Faust میں ابلیس کی تصویر پیش کی ہے جس سے ابلیس کے کردار کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔

اقبال نے متعدد نظموں میں (خصوصاً فارسی جاوید نامہ میں)

ابلیس کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے، اور اسے حرکت، حرارت، ذہانت، اضطراب اور بے تابی کی صفات سے متصف کیا ہے اور یہ بھی بعض نظموں میں ہے کہ اس کا وجود نفی و مزاحمت کا وسیلہ ہے جس کا مقابلہ خیر اور اثبات کو کرنا پڑتا ہے۔

اقبال کی بعض نظموں میں اور شعروں میں ابلیس کی جس طرح تعریف کی گئی ہے وہ کھٹکتی ہے۔ مگر یہ امر ہر حال میں مدِ نظر رہے کہ اقبال ابلیس کی تعریف کر کے بھی آدم کی برتری جتاتے ہیں اور یہ واضح کرتے ہیں کہ آدمؑ، ابلیس ایسے زیرک، ذہین، سرگرم اور چالاک حریف سے محض عشق کی بدولت بالآخر بازی لے جاتے ہیں۔ اور اب بھی اس کی طرف سے جو عیاری اور چالاکی اور مزاحمت ہے وہ ابنِ آدم کے جوہرِ عشق کو آزمانے اور اس کی ترقی کے راستے صاف کرنے کی خاطر ہے۔ غرض یہ مزاحمت اور یہ پیکار اس کی خودی کے استحکام کا ذریعہ ہے۔

خودی کا استحکام — تعلیم و تربیت

تخلیقِ مقاصد کی بحث میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ خودی کا منبع عشق (آرزو یا جوشِ حیات) ہے۔ اس آرزو کے راستے میں پیکار لازمی شے ہے۔ عشق کائنات کے ذرے ذرے میں ہے اور پیکار بھی حیات کا ایک ناگزیر اصول ہے۔ اس کی طلاق کائنات کے سب شعبوں کی طرح انسان پر بھی ہوتا ہے۔

کائنات کے دوسرے شعبوں کے مقابلے میں انسان کو کچھ تفوق حاصل ہیں (—— دوسری کے برعکس میں اسے خدا کی خاص مہربانی اور کرم خیال کرتا ہوں۔ غور کیجئے تو آخر بات خدا تک ہی پہنچتی ہے) انسان کا ایک تفوق یہ ہے کہ اسے عقل اور زیرکی دی ہے۔ اسے اپنے آپ کو بدلنے اور بہتر بنانے کی صلاحیت بھی دی ہے۔ اور تعلیم و تربیت اور عقل و تجربہ کے بہتر استعمال سے اسے نیچر کو مسخر کرنے اور اس کے اٹل قوانین کے باوجود اس کے فیصلوں کو بدل دینے یا کم از کم ان کا رُخ موڑ دینے کی قوت عطا کی ہے۔ انسان نیچر سے دشمنی نہیں کر سکتا مگر اس کے قوانین کو متبادل عمل سے بے اثر بنا سکتا ہے۔

عقل کی بحث اپنے موقع پر آئیگی۔ اجمالاً یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ کلامِ اقبال میں عقل و عشق کے مقابلے میں عقل کے خلاف بہت کچھ ہے مگر یہ

مخالفت عقلِ محض کی ہے جو زندگی کے عادلانہ عمل میں اعتقاد نہیں رکھتی ورنہ میری نظر میں اقبال عقل کو خودی کے استحکام کا ایک وسیلہ سمجھتے ہیں۔ بہرحال یہ ذکر آگے آئے گا۔

خودی کی تربیت عقلی تعلیم کے مقابلے میں اندر کی جبلتوں کو قابو میں لانے سے ہو سکتی ہے۔ عقلی تعلیم بھی جبلتوں کا خیال رکھتی ہے مگر اس کا کام اصولوں اور تجربوں کی آموزش ہے۔ نفوس کو معتدل بنانا اور جبلتوں کے عمل میں ایسی ہمواری پیدا کرنا کہ وہ زندگی کی ترقی کے عادلانہ عمل میں ممد ہو، عقلی تعلیم کے دائرے میں بطورِ خاص شامل نہیں ——— یہ اور بات ہے کہ آج کل عقلی تعلیم کے علمبردار اس کے مدعی ہیں۔ اور یہ بھی اور بات ہے کہ تربیتِ نفوس میں عقل کی مدد بھی شامل ہو سکتی ہے۔

اندر کی جبلتوں کو قابو میں لانا خودی کی تربیت کا مرحلہ اوّل ہے۔ اس کی پہلی منزل اطاعت ہے اور دوسری منزل ضبطِ نفس۔

اطاعت سے مراد یہ ہے کہ تربیت کرنے والا جو ہدایات دیتا جائے، جو فرائض سپرد کرتا جائے، بے چون و چرا ان پر عمل ہوتا رہے۔ اقبال نے اِس سلسلے میں اونٹ کی مثال دی ہے اور لکھا ہے کہ اونٹ کا شیوہ خدمت و محنت اور صبر و استقلال ہے۔ وہ چپ چاپ منزل کی طرف بڑھتا جاتا ہے کم خورد و کم خواب و محنت پیشہ ——— بڑے صبر سے اپنے فرائض انجام دیتا رہتا ہے۔

اقبال اس سلسلے میں اطاعت سے مراد آئین کی پابندی لے رہے ہیں۔

یہ آئین کیا چیز ہے؟ ظاہر ہے اس سے مراد زندگی کی ہموار ترقی کے لئے انسان کو حاصل شدہ جملہ قاعدے، اصول اور دستور ہوں گے جو انسانی تہذیب نے اسے سکھائے ـــــ جہاں تک اقبال کے خطاب خاص کا تعلق ہے اس سے مراد وہ آئین ہے جو ہادیٔ برحق نے دنیا کو دیا۔ اور خود خدا کا آخری و مکمل ترین آئین ہے ؎

باز اے آزاد دستورِ قدیم
زینت پا کن ہمیں زنجیر سیم
شکوہ سنج سختی آئیں مشو
از حدودِ مصطفیٰؐ بیروں مشو

یعنی اے وہ کہ اپنے آپ کو اس آئین قدیم سے آزاد سمجھتا ہے یا اس سے نکل بھاگنا چاہتا ہے پھر اسی زنجیر کا اسیر ہو جا۔ اس کی سختیوں کی شکایت نہ کر اور حضرت مصطفیٰؐ کی حدود سے باہر نہ نکل۔

قرآن مجید کا عادلانہ قانون تمام دنیا کے لئے ہے جو لوگ اس پر یقین نہیں رکھتے عملاً ان کا عمل (اگر وہ عادلانہ ہے تو) اسی کے مطابق ہے ـــ تمام دنیا اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہے اور ایک حد تک اٹھا بھی رہی ہے۔

مگر فرض کیجئے اطاعت کو اقبال کی دینی اصطلاحوں میں نہ بھی لیا جائے تب بھی آئین کی اطاعت فرد کی تربیت بلکہ تربیت یافتہ فرد کا پہلا فرض ہے آئین کی پابندی انسان ہی نہیں، کائنات کی ہر شے کر رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ اطاعت ایک خودکار جبری عمل ہے (یعنی ہم جہاں تک آئین کے

اصولوں کو جان سکتے ہیں) انسان ایک اکتسابی حیوان ہے جو دوسرے حیوانات کے مقابلے میں زندگی کے زیادہ سرمائے سے بہرہ ور ہے اس کا اکتسابی عمل شعوری طور پر تربیت پاتا ہے ——— تاہم انسان کو اس مرحلہ اول میں نیچر کی اشیا کی طرح اپنے اوپر جبری تربیت نافذ کرنی پڑتی ہے تاکہ وہ ماحول کی فضا اور آب و ہوا سے مانوس ہو کر اسے ترقی دینے کے قابل ہو سکے۔ ماحول کا دیا ہوا قانون (داخلی و خارجی) اس کی فضا اور اس کی آب و ہوا ہے۔ اس سے توافق پیدا کیے بغیر وہ ترقی کا ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا جس طرح نیچر کی اشیاء غیر سے بیکار کے باوجود پہلے اپنے ماحول سے توافق پیدا کرتی ہیں۔ بہر حال اطاعت زندگی کی تربیت و ترقی کا پہلا اصول ہے۔

ضبطِ نفس:

دو جبلتیں (جو خود حفاظتی جبلت کی کارندہ ہیں) یعنی خوف اور طمع [ناگوار چیز کے خلاف خطرے کا احساس اور خوشگوار چیز کے حاصل کرنے کی خواہش (حب)] نفس انسانی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ انسان ان سے بہت کام لیتا ہے مگر بعض اوقات ان سے مغلوب بھی ہو جاتا ہے۔ اور زندگی کی ہموار ترقی اور عادلانہ عمل میں اس کے باعث بہت خلل واقع ہوتا ہے۔ بے جا خوف اور بے جا طمع سے انسان کی ذاتی زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ بے جا خوف سے بزدلی، سازش، بدگمانی اور کمینگی پیدا ہوتی ہے اور بے جا طمع سے زیادتی، مکاری، استحصال، خود غرضی، غصب، عیاری، ذخیرہ اندوزی اور ظالمانہ قوانین جیسی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

گویا خوف اور طمع پر زندگی کے نظم اور حسن و اعتدال کو بگاڑنے کی شدید ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ نیچر خود اس نظم و حسن کی خاطر بہت کچھ کرتی رہتی ہے اور اپنی قلمرو میں جوں توں یہ نظم و حسن پیدا کرتی رہتی ہے ــــ مگر انسان حرکت کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور عاقل بھی ہے۔ اس لئے اس کو خدا نے یہ سہولتیں اور اختیارات دیکر اس پر بڑی ذمہ داری عائد کی ہے لیکن انسان تجاوز کر جاتا ہے اور ان سہولتوں سے بعض اوقات ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے ــــ (ظلوما جہولا" کی تہہ بد اسی لئے تو اسے سنتی پڑی ہم)

اس وجہ سے دین اور تصوف دونوں نے خوف اور طمع کو ایک قاعدے کے اندر رکھنے کی بڑی تاکید کی ہے ــــ اقبال نے بھی اس پر زور دیا ہے ــــ اطاعت کے عمل سے نفس اپنے معلم، اپنے ہادی اور اپنے آئین کی ہر بات ماننے کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اسے تسلیم کرنیکی عادت ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ان اندیشوں اور خوفوں کو بھی نظر انداز کرنے کا عادی ہو جاتا ہے جن کے ریچ ہونے کا یقین آئین میں موجود ہوتا ہے۔ [غیر اللہ کا خوف اس کے دل سے نکل جاتا ہے] اور ان چیزوں کی محبت (اور طمع) جو اس کے لئے باعثِ کشش نہیں رہتی جو آئینِ زندگی اور آئینِ الٰہی کے تقاضائے حسن و عدل کے خلاف ہیں۔ اطاعت میں اس کا نفس اور اس کا خود اتنا ڈسپلن حاصل کر لیتا ہے کہ وہ جبلتوں پر قادر ہی نہیں ہو جاتا بلکہ ان کے میلان سے الٹا چلنے پر بھی قادر ہو جاتا ہے۔ خوف ایک

جبلّی میلان ہے لیکن اطاعت کے ذریعہ اسے جو یقین حاصل ہو گیا ہے۔ اس کی بدولت وہ خوف کی جبلّت پر قابو پالیتا ہے۔ وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا ۔۔۔ اور اللہ کا ڈر بھی فواحش عدل وخیر کی خاطر ہے بے مقصد ڈر نہیں ہوتا۔

وہ اشیاءِ مرغوب (شہوات)، کی حُب کی جبلّت پر بھی قابو پالیتا ہے۔ اس کے عام قاعدے کے برعکس (لینے کچھ لے کر خوش ہونے کے بجائے) کچھ دے کر خوش ہوتا ہے ۔۔۔ اور یہ عجیب فضیلت ہے انسان کی کہ وہ اپنی جبلّت کے برعکس زکوٰۃ دے کر، خیرات وصدقات سے اور ایثار و قربانی کر کے خوش ہوتا ہے ۔۔۔ پھر کیوں نہ وہ ہر چیز سے فائق ہو جانے کا دعویٰ کرے کہ اس نے اپنی جبلّت کا رخ موڑ دیا۔

یہی وہ فقر ہے جس پر آنحضرتؐ نے فخر کیا تھا اور یہی وہ فقر ہے جو اسے اطاعت وضبطِ نفس کا دیا ہوا ہے ۔۔۔ اور جو فرد یا افراد کا مجموعہ ایسا ہو اس کی طاقت اور قدرت کا انکار کیسے ہو سکتا ہے ۔۔۔ نظمِ حیات اور عدلِ زندگی کی خاطر جو لوگ ان کمالات کے مالک ہو جاتے ہیں ان کے نائبِ الٰہی ہونے میں کیا شک ہے ۔۔۔ اور یہ ان افراد کو حاصل ہوتا ہے جو اطاعت اور ضبطِ نفس کی ریاضت کر کے ناظمِ کائنات کی نیابت کے حقدار بن جاتے ہیں اور خدا کی صفات کو اپنے اندر جذب کر کے دنیا میں نظم وعدل وخیر کے وہ سلسلے قائم کرتے ہیں جو خدا چاہتا ہے۔ اور دنیا کو ترقی کے راستے پر اس طرح چلاتے ہیں جس طرح

خود خدا کا منشا ہے۔ (یعنی زندگی خدا کے مطابق بنے بھی حسین سے حسین تر ہوتی جائے اور خدا کی صفات زیادہ سے زیادہ خدائی میں جلوہ گر ہوتی جائیں)

یہ نائب الٰہی خدا کی صفات کا مظہرِ کامل ہوتا ہے ؎

از رموزِ جزو کل آگاہ بود

در جہاں قائم بامر اللہ بود

یعنی وہ ہر جزو کل کے بھیدوں سے واقف ہوتا ہے اور دنیا میں وہ مستقلاً قائم و منتظم ہوتا ہے گویا "امرِ الٰہی" اس کا رفیق ہے۔ وہ معجزے دکھا سکتا ہے۔ اس کی ایک بات سے انقلاب برپا ہو سکتا ہے —۔ وہ قادرِ مطلق تو نہیں مگر قدرت کے بیکراں وسیلے اس کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔

نیابتِ الٰہی کے بارے میں طرح طرح کے سوال اٹھائے گئے ہیں۔ ایک بڑا سوال یہ ہے کہ نیابت کے لئے کوئی ایک فرد مخصوص ہوتا ہے یا ایک زمانے میں ایک سے زیادہ آدمی اس کمال سے فیضیاب سکتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ نیابت کا کامل ترین نمونہ تو ایک فرد ہی ہو سکتا ہے باقی درجہ بدرجہ کم و بیش اس کمال میں حصہ دار ہو سکتے ہیں۔

اقبال کی اصطلاح میں نبی نائب حق ہوتا ہے اور آنحضرتؐ کی ذات اس نیابت کا نمونہ اکمل ہے۔ اقوام الٰہی فیض یافتہ افراد سے

تربیت کا سبق سیکھتی ہیں اور اسی کے ذریعے آیا ہوا آئین اطاعت کے لئے دستور العمل بنتا ہے۔ مردِ مومن: وہ اس دستور العمل میں عقیدہ بھی رکھتا ہے اور اپنی بساط کے مطابق اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ مردِ کامل[1] وہ ان افراد میں سے، زیادہ سے زیادہ، نائبِ حق کی سیرت سے متاثر ہوں اور اس کی پیروی کامل سے اس کے نقش اپنے اندر جذب کر سکیں

نائبِ حق، وہ کامل ترین مظہر انسانی اور عکسِ صفاتِ ربانی جو دنیا کے نظام کی ہمواری اور اس کی ترقی کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں ——— زمانے کی سلطانی ان کے پاس ہوتی ہے مگر وہ خود اس میں فقیرانہ بسر کرتے ہیں ——— آنحضرتؐ کی ذاتِ مبارک اور خلفائے راشدینؓ کی زندگیاں ایسی ہی تھیں۔

۱۔ بعض مصنفوں نے مردِ مومن اور مردِ کامل میں امتیاز نہیں کیا مگر میرے عاجزانہ خیال میں ان دونوں میں رتبے اور درجے کا فرق ہے۔

خودی کا استحکام ـــــ عقل

عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ اقبال نے عقل کو بہت بُری شے خیال کیا ہے۔ بظاہر اس خیال کی تائید ان کے بیشمار اشعار سے بھی ہوتی ہے۔ مگر واقعتاً ایسا نہیں۔ عقل کے خلاف جب بھی اقبال نے لکھا ہے اس کا ایک خاص محل ہے۔ عقل فی نفسہ بری، غیر ضروری اور مذموم شے نہیں۔ اس کو وہ تبھی مذموم کہتے ہیں جب دین یا عشق کے مقابلے میں کوئی اس کو بطور مدِ مقابل کھڑا کرتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عقل اقبال کے نزدیک خودی کے ذرائع قوت میں سے ہے۔ تعلیم و تربیت جس کی مدد سے خودی کو تقویت دی جاتی ہے۔ جبلتوں کی تنظیم اور ان کے انقیاد کے علاوہ عقل کے استعمال پر منحصر ہے ؎

خیز و نقش عالم دیگر بنہ
عشق را با زیرکی آمیز دہ

یعنی تم عشق کو زیرکی کے ساتھ ملا کر ایک نئی دنیا کی تخلیق کر سکتے ہو۔

پھر بھی یہ ماننا ضروری ہے کہ اقبال نے عقل کی جہاں جہاں مذمت کی ہے اس کے اسباب کیا ہیں؟ فہرست یوں بن سکتی ہیں۔

(۱) زندگی کی کل اصل میں عشق [جوشِ حیات + آرزو + یقین + ذوقِ تسخیر] سے چلتی ہے۔ عقل اس کاروبار میں محض کارندہ ہے۔

اس کو سب کچھ سمجھنا غلطی ہے۔

(۲) عقل حقیقت کا کلی ادراک نہیں کر سکتی۔ حقیقت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دیکھ سکتی ہے یعنی جزوی ادراک کر سکتی ہے۔ اس کو علم و ادراک کا واحد سرچشمہ سمجھنا غلطی ہے۔

(۳) چونکہ عقل حواسِ خمسہ کی مدد سے نتیجے اخذ کرتی ہے اس لئے اس کے نتیجے غلط بھی ہو جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ حواس کی قدرت و قابلیت خود مکمل نہیں۔ ایک سیدھی چھڑی پانی میں رکھدی جائے تو آنکھ کو وہ ٹیڑھی نظر آئے گی حالانکہ وہ ٹیڑھی نہیں ہوتی سیدھی ہی ہوتی ہے۔ گویا حسِ بصارت کو دھوکا لگ سکتا ہے۔ اسی طرح باقی حواس کا حال ہے۔ جب عقل کے سرچشموں کا یہ حال ہے تو عقل کا حال ان سے کیونکر بہتر ہو گا۔

(۴) عقل شک اور ظن کو اُبھارتی ہے اور اس کا حاصل شدہ علم شک و ظن کی پیداوار ہوتا ہے ۔ عقل اس یقین سے محروم ہے جو وجدانی علم کا خاصّہ ہے۔

(۵) عقل، محض کارندہ ہے۔ یہ بُرائی کی بھی اسی طرح موید بن سکتی ہے جس طرح نیکی کی۔ بُرے لوگ عقل کی مدد سے بہت بُرے ہو جاتے ہیں۔ ایمان اور وجدانی علم سچائیوں سے ابھرتا ہے اور سچائیوں کا ساتھ دیتا ہے۔ البتہ عقل اور سچائی مل جائیں تو اکسیر ہے۔

(۶) عقل تقویت کا باعث بھی ہو سکتی ہے مگر وہم اور خوف کو ابھار کر بیماری اور بزدلی اور کمینگی بھی پیدا کر سکتی ہے۔

یہ اور اس قسم کے دوسرے وجوہ ہیں جن کی وجہ سے پرانے صوفیوں اور اقبال نے بھی عقل کو دوسرے درجے پر رکھا ہے ۔ اطاعت میں نفس کا کامل انقیاد لازمی ہے اور ضبطِ نفس میں عقل کی فطرت کے برعکس خوف اور طمع کی جبلتوں سے انسان کو آزاد کرنے کی کوشش کی گئی۔

البتہ یہ جب ہو جائے تو اس کے بعد عقل اور زیرکی کی امداد حاصل کی جا سکتی ہے اور وہ امداد بڑی قوت و طاقت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس صورت میں عقل اخلاقی اور وجدانی قدروں کی تابع ہو کر چلے گی اور اس سے وہ غلطیاں سرزد نہ ہوں گی جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عقل اقبال کی نظر میں ایک مفید بلکہ ضروری شے ہے مگر اسے ایک ڈسپلن کے تحت رکھنے کی ضرورت ہے یعنی سچائی اور نیکی کے وجدان (ایمان) کے تابع تاکہ نوعِ انسان کیلئے باعثِ برکت ثابت ہو نہ کہ باعثِ ہلاکت۔ اگر عقل کی باگ غیر تربیت یافتہ حیوانی جبلتوں کے ہاتھ میں ہو گی تو ہموار زندگی اور عادلانہ ترقی (جو انسان کا برتر نصب العین ہے) درہم برہم ہو جائیگی۔

پس اقبال کا مقصد اسی قدر ہے کہ عقل کی باگ ایمان کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ یہ مقصد ہرگز نہیں کہ عقل ایک غیر ضروری شے ہے۔ عقل اپنے مقام پر نہایت ضروری چیز ہے۔

اقبال نے عقلی علم کے متعلق بھی اسی طرح اظہارِ خیال کیا ہے۔
اقبال عقلی علم کے منکر نہیں مگر اس کو ناکافی، غیر یقینی اور بے رنگ سے سمجھتے ہیں۔ بے رنگ سے مطلب یہ ہے کہ اس میں لذتِ یقین نہیں ہوتی، تشکیک بڑھتی جاتی ہے اور عمل کے اقدام میں تذبذب اور جھجک پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ عقلی علم یک رُخا ہوتا ہے ساری حقیقت کو بیک وقت نہیں دیکھ سکتا ——— یہی وجہ ہے کہ مغربی فلسفے جب کوئی نظریہ اخذ کرتے ہیں تو ناک کی سیدھ پر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ دائیں بائیں پھیلی ہوئی حقیقتوں کو یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اور فکر کی جس غلطی کو درست کرنے کے مدعی ہوتے ہیں اس سے زیادہ بڑی غلطیاں خود کر جاتے ہیں۔ چونکہ عقلی علم نظریہ ہی نظریہ ہوتا ہے اس لیے اس میں کسی چیز کی کوئی یقینی تعریف ممکن نہیں، نیکی، حسن، حق بلکہ خود علم اور وجود کی قطعی تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔

اس وجہ سے اقبال نے مغربی تمدن کی بھی مخالفت کی ہے۔ کیونکہ اس کی اساس مادیت کے علاوہ اس عقلیت پر بھی ہے۔ یہ بحث آگے آئے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اقبال نے علم اور عقل کے خلاف لکھا ضرور ہے مگر یہ ساری مخالفت اس کے غلط درجے اور غلط استعمال کی بنا پر ہے فی نفسہ علم اور عقل کی مخالفت نہیں۔

عقلِ ایمانی پر ان کا ایمان ہے اور دانشِ ایمانی پر ان کا یقینِ کامل ہے

خودی کے سلسلۂ عمل میں، میں بتا چکا ہوں کہ عشق کے اندر سے ایک دانش (Cognition) خود بھی ابھرتی ہے۔ یہ دانش دلیل و برہان سے نہیں بلکہ عشق کے فیض سے ہوتی ہے، اس میں عمل و تجربہ دانش آموزی کرتا ہے نہ کہ محض نظریہ و برہان ۔۔۔ تاہم خودی کے عمل میں دانش برہانی بھی مذموم نہیں بشرطیکہ اس کی باگ ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ باقی رہا سائنسی علم، سو وہ تو منطقی دلیل پر نہیں بلکہ تجربے پر قائم ہے۔ اس کے صحیح و برمحل ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ البتہ اس کے نتائج کو فلسفے کی بنیاد بنا لینے سے وہی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں جو خالص عقلی فلسفے سے ہوئیں۔

اجتماعی خودی

اب تک جو کچھ بیان ہوا ہے اس کا تعلق عام طور سے فرد سے تھا لیکن یہ امر بھی ساتھ ساتھ واضح ہوتا رہا ہے کہ ایک خاص دائرے کو چھوڑ کر انسان کے جملہ مسائل اس جماعت کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ جس کا وہ فرد ہے ـــــ اسی لئے انفرادی خودی کے معاملے میں بھی فرد، جماعت سے کسی صورت بے نیاز نہیں ہو سکتا ـــ اس کے لئے اقبال نے اسلامی اصطلاح "ملت" استعمال کی ہے ـــ اکثر اجتماعی مسئلوں میں فرد کو اپنی فردیت یعنی انفرادی خودی کو ترک کرنا پڑتا ہے اور بعض آزادیوں کو ملت کی خاطر قربان کرنا پڑتا ہے ـــ اقبال نے اس قربانی کے لئے بے خودی کی اصطلاح استعمال کی ہے ـــ اور اس موضوع پر ایک مثنوی فارسی میں لکھی ہے ـــ جس کا نام رموزِ بے خودی ہے ـــ

رموزِ بے خودی کی تشریح سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اقبال ملت (منظم اجتماع) کو بھی ایک جسمِ واحد خیال کرتے ہیں اور یہ فرماتے ہیں کہ افراد کی طرح قوموں اور ملتوں کی بھی خودی ہوتی ہے اور اس کے استحکام و ضعف کے بھی تقریباً وہی اصول ہیں جن کا ذکر فرد کی خودی کے سلسلے میں آچکا ہے اگرچہ یہ امر پھر واضح کرنا ضروری ہے کہ فرد اور ملت کو باہمی لازم و ملزوم سمجھنا چاہئے ـ فرد، ملت کے بغیر جینا چاہے تو ممکن ہے

کچھ دیر جی لے مگر اس کی تکمیل یا با معنی زندگی ملّت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

(رموزِ بے خودی (اجتماعی زندگی)

مثنوی رموزِ بے خودی کی پہلی باقاعدہ بحث بطور تمہید "فرد و ملّت کے ربط" کے بارے میں ہے

اقبال کی نظر میں فرد کے لئے کسی جماعت سے ربط باعثِ رحمت ہے۔ کیوں کہ اس کے جوہر کی تکمیل ملّت (جماعت) کی بدولت ہوتی ہے، گذشتہ اوراق میں بیان ہو چکا ہے کہ انسان کے دل میں آرزو یا مقصد کی لگن کا ایک خارجی سبب یہ بھی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں میں رہ کر ان میں فوقیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ اس کی جبلّت ہے۔ دوسرے انسانوں سے مل جل کر رہنا اس کے حفظِ ذات کا ذریعہ ہے اور ان میں فوقیت پا کر اپنے جوہر کی تکمیل کا وسیلہ بھی ـــــ پس اس لحاظ سے جماعت اور ملّت فرد کے لئے باعثِ رحمت ہے۔

اقبال کے خیال میں فرد اور قوم ایک دوسرے کے لئے مثل "آئینہ یک دیگر" ہیں ـــــ یعنی فرد خود کو یا اپنے کمال کا چہرہ قوم کے آئینے میں دیکھتا ہے اور جماعت اپنا چہرہ افراد کے آئینے میں دیکھتی ہے یعنی کسی جماعت کی فضیلت کا ثبوت یہ ہے اس کے افراد جوہرِ کمال سے آراستہ ہوں، اور فرد کی فضیلت کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنی جماعت کے مقاصد کے لئے کہاں تک مفید ہے۔ اور جماعت کے افراد کے باہمی مقابلے میں اس کا درجہ

کیا ہے ؟ غرض دونوں ایک دوسرے کی فضیلت و برتری کا آئینہ ہیں۔

فرد کا رتبہ ملّت کے حوالے سے متعین ہوتا ہے، اسی کی بنا پر اُسے احترام حاصل ہوتا ہے اور اس کے بالعکس ملّت، افراد کا نظام افراد پر منحصر ہے یعنی ان کے اختلاط اور باہمی تعاون سے۔

فرد جب اس طرح اپنی خودی کی قربانی کرتا ہے تو وہ ضائع نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی انفرادیت ایک لحاظ سے وسعت پا جاتی ہے۔ وہ جماعت کے باقی افراد سے ــــ اور ماضی کی سیرت سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے، اس طرح قربانی کے باوجود فرد کی ہستی اگر پہلے قطرہ تھی تو اب قلزم کی مانند وسیع و بیکراں ہو جاتی ہے، اور یہی نہیں کہ ماضی کی سیرت اس میں سمٹ کر آ جاتی ہے بلکہ افراد کے اوصاف اور سیرت جماعت کے مستقبل میں بھی منعکس ہوتی ہے ـــ غرض فرد ملّت کا احترام کر کے بہت کچھ حاصل کرتا ہے ؎

در دلش ذوقِ نمو ملّت است

احتساب کار او از ملّت است

یعنی فرد کے دل میں آگے بڑھنے کی آرزو، ملّت کی وجہ سے ہوتی ہے مسابقت کے علاوہ ملّت کے مقاصد کی تکمیل کا جذبہ اسے مہمیز کرتا ہے۔ اور خاص بات یہ ہے کہ ملّت فرد کے کاموں کی جانچ پڑتال کر کے اس کی جدوجہد کو غلط راستوں میں جانے سے روکتی بھی ہے۔

فرد تنہا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ وہ مقاصد سے بے خبر ہوتا ہے

قوم یا جماعت اسے مقاصد سے اور یکجہ جذبے سے آشنا کرتی ہے۔

فرد کی خودی کو اپنے خول میں جاگزیں ہونے کے بعد ماحول سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہیں سے نیچر سے اور باقی افرادِ جماعت سے ایک خاص قسم کے رابطے کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور اسے اپنے علاوہ دوسرے کا بھی احساس ہوتا ہے یہ احساس اسے مجبور کرتا ہے کہ اپنے ماحول سے توافق پیدا کرے۔ وہ ماحول سے پیکار بھی کرتا ہے مگر اس توافق میں وہ ماحول کے لئے اپنی جگہ چھوڑ بھی دیتا ہے۔ نیچر میں بھی توافق کا اصول جاری ہے۔

در جماعت خود شکن گردد خودی
تا ز گلبرگے چمن گردد خودی

خودی جماعت کے لئے خود کی قربانی پر آمادہ ہو جاتی ہے مگر اس قربانی سے اسے نقصان نہیں ہوتا۔ اگر وہ پہلے ایک برگِ گل تھی تو اس قربانی کے بعد چمن بن جاتی ہے!

یہ تو معلوم ہو گیا کہ ملت افراد کے اختلاط سے منظم ہوتی ہے — مگر یہ تنظیم خود بخود محکم نہیں ہوتی۔ انسان محفلِ ہستی میں طرح طرح کے اندیشے لیکر داخل ہوتا ہے اور آسانی سے یہ ربط باہمی ممکن نہیں ہوتا اس ربط کو آسان بنانے کے لئے خدا کسی صاحبِ دل (نبی ؑ) کو مبعوث کرتا ہے جس کا دل ان اندیشوں سے پاک ہوتا ہے۔ یہ فردِ خاص الخاص (نبی ؑ) پھر افراد میں ربط پیدا کرتا ہے۔ اور دلوں کو ان اندیشوں

سے پاک کر دیتا ہے جو عام افراد کو منتشر رکھتے ہیں۔

ناسوئے یک مدعا یش می کشد
حلقۂ آئیں بپا یش می کشد
نکتۂ توحید باز آموز دش
رسم و آئین نیاز آموز دش

اقبال کے نزدیک ملت کے احساس کی تقویت کا انحصار، روایات ملت کے تحفظ پر ہے۔ ملی روایات کا سرمایہ تاریخ ہے۔ وہ اقوام جو ملت کے تسلسل اور ان کے تحفظ کا خیال رکھتی ہیں اپنی تاریخ کو بھی محفوظ رکھتی ہیں۔ اس سے ان کی اجتماعی زندگی میں ربط و نظام پیدا ہوتا ہے، اور ماضی کا حال و مستقبل سے پیوند قائم ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں ؎

ضبط کن تاریخ را پاینده شو
از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو

یعنی اپنی تاریخ کو محفوظ کر کے بقائے دوام حاصل کر و گذرے ہوئے زمانے سے بھی زندگی مل سکتی ہے۔

دنیا میں جو اقوام اپنی ملی زندگی کی وسعت چاہتی ہیں وہ نظام عالم کی قوتوں کو تسخیر کرتی ہیں۔ ماسوائے اللہ، یعنی کائنات دراصل ہے ہی تسخیر کے لئے۔ انسان زمین پر نائب حق ہے اس کی قدرت میں ہے کہ وہ حکمت و علم اسماء، کی مدد سے کائنات کو مسخر کرے اور اس سے کام لے۔

ہر قوم آئین اتباع سے پختہ و مستحکم ہوتی ہے —— اور مسلمانوں

کے لئے یہ آیت قرآن مجید کی صورت میں موجود ہے۔ اور اس میں آنحضرتؐ کا اسوۂ حسنہ بہترین نمونہ ہے۔

ملتِ اسلام ــــــ تمدن کی بنیادیں

اقبال نے ملت اور قوم کیلئے عمومی اصول بھی دیئے ہیں ـــ مگر حقیقت ہے کہ اقبال کی نظر میں ملت اسلامیہ اور اسکی تمدنی بنیادیں دوسرے تصورات تمدنی کے مقابلہ میں زیادہ صحت مند اور انسانیت کے لئے شاید مثالی دستور العمل کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ اسی وجہ سے اقبال کے پیش کردہ اصول بظاہر مسلمانوں سے مخصوص ہوتے ہوئے بھی ساری انسانیت کے لیے قابل عمل ہیں ۔

نبوت کی اہمیت جتلانے کے بعد اقبال ملت اسلامیہ کے جن ارکان اساسی کا ذکر کرتے ہیں وہ یہ ہیں :-

(۱) توحید

(۲) رسالت

اقبال نے تمدنِ اسلامی کی ساری بحثوں کی بنیاد انہی دو ارکان پر رکھی ہے۔

توحید کے معنی فقط یہی نہیں کہ خدا کو ایک مانا جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ زندگی کی وحدت کو تسلیم کیا جائے ـــ اور تمام انسانی اعمال و افعال کا مقصد اسی وحدت کی تلاش کو قرار دیا جائے ۔ کوئی ملت اس وقت تک ملت نہیں بن سکتی جب تک اس کے افراد میں یہ وحدت پیدا نہیں ہو جاتی اور اس کے افراد کے خیالات اور مقاصد میں وحدت پیدا نہیں ہو جاتی۔

توحید کے معنی یہ بھی ہیں کہ غیر اللہ کا خوف دل سے نکال دیا جائے جو افراد یا اقوام غیر اللہ سے خائف ہوتی ہیں ان کے دل پر خوف، حزن اور یاس جیسی امراض خبیثہ غالب آجاتی ہیں اور وہ اپنی خودی کو کھو بیٹھتی ہیں ۔

سورۂ اخلاص میں ھو اللہ احد اور اللہ صمد کے یہی معنی ہیں ۔ اس کے ساتھ کسی اور کو ہمسر اور شریک بنانا یا سمجھنا بھی ملت کے احساس خودی کو نقصان پہنچاتا ہے

منصب رسالت و نبوت انسانی اجتماع میں ربط پیدا کرنے کے لئے ہے ۔ آنحضرتؐ اس سلسلے کے خاتم ہیں ۔ اور یہ اس لئے ہے کہ اسلام میں آنے والے تمام ادوار کے لئے ہدایات موجود ہیں ۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ رسالتِ محمدیہ کا مقصد تمام بنی نوعِ آدم کی اخوت، مساوات اور آزادی ہے ۔ آنحضرتؐ نے اور ان کے خلفاءؓ نے اس کے عملی نمونے بھی پیش کر دیئے ہیں ۔!

ان وجوہ سے اسلام مکان اور زمان دونوں کے لحاظ سے بے نہایت ہے یعنی کسی ایک زمانے تک محدود نہیں بلکہ ہمیشہ رہے گا اور کسی ایک قوم یا ملک سے وابستہ نہیں

اسلام میں قومیت (ملی تصور) وطن اور رنگ اور نسل سے وابستہ نہیں ۔ اس کی بنیاد عقیدۂ توحید و رسالت پر ہے ۔ اس کا آئین قرآن ہے اور نمونہ آنحضرتؐ کا قول و عمل ۔! قرآن ازلی ابدی ضرور توں

کے لئے کافی ہے اور قرآن کو ہر زمانے کے حالات میں معیار بنانے کے لئے اجتہاد ضروری ہے ۔۔ مگر اجتہاد ہر کہ دمہ کا کام نہیں ۔ اجتہاد کرنے والا اتباعِ سیرتِ محمدؐیہ میں کامل اور دین کے تفقہ میں اکمل ہونا چاہئے ۔ اگر یہ نہیں تو اجتہاد ملت کے انتشار کا باعث ہوگا ... اقبال فرماتے ہیں کہ زمانہ انحطاط میں تقلید اجتہاد سے بہتر ہے ۔ لیکن اصولی طور پر فرد فرد ہے اور ملت افراد کے مجموعے کا نام ہے اس لئے ملت کے لئے لازم ہے کہ افراد کی فردیت کا احترام کرے اور اس کی انفرادی تکمیل کے راستے میں روڑے نہ اٹکائے ایک اچھا فرد خود بخود ملت کے نظام کا ایک صحت مند جزو ہوتا ہے اس لئے جہاں فرد ملت کے لئے اپنی فردیت کی کچھ قربانی کرتا ہے وہاں ملت کو بھی فرد کی بنیادی آزادیوں کا خیال رکھنا چاہئے ۔ اس طرح فرد اپنی خودی کو بے خودی میں بدل سکتا ہے ۔ اور یہی بے خودی ملت کی خودی کی بنیاد بنتی ہے ۔ مولانا روم نے فرمایا ہے ...

جہد کن در بیخودی خود را بیاب
زود تر واللہ عالم بالصواب

یعنی کوشش کر کے بے خودی کے ذریعہ خود کو پھر پالو ۔ جلدی بہت جلدی ۔ باقی صحیح کیا ہے اس کا بہتر علم اللہ کو ہے ۔

خودی کا ضعف

یہ بیان ہو چکا ہے کہ خودی، ترتیب سے مستحکم ہو جاتی ہے۔ پس جس طرح خودی کا مستحکم ہونا ممکن ہے اسی طرح اس کا ضعیف ہونا بھی ممکن ہے۔

ضعف کے اسباب میں اوّل تو یہ سبب ہے کہ ترتیب کے لوازم پر صحیح عمل نہ ہو۔ مگر ایک سبب جس کا اقبال نے خاص طور سے ذکر کیا ہے یہ ہے کہ خودی سوال سے ضعیف ہوتی ہے۔

سوال کے کئی معنی ہیں۔ ایک تو وہی عام معنی ہیں جو سب کو معلوم ہیں، لیکن اقبال کے سارے کلام کو سامنے رکھکر کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک اجتماعی سطح پر عام دست نگری مگر انفرادی سطح پر معاش کے معاملے میں دوسروں کا دست نگر ہونا خودی کے لئے قاطع ہے۔

چونکہ تن کی ضرورتیں قدرتی اور ناگزیر ہیں اس لئے ان ضرورتوں کا صحیح علاج یہ ہے کہ اپنی روزی خود کمائی جائے اور دوسروں پر بوجھ نہ ڈالا جائے۔

اقبال نے آنحضرتؐ کی حدیث بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسی وجہ سے حضورؐ نے کاسب (اپنی روزی خود پیدا کرنیوالے) کو اللہ کا دوست قرار دیا ہے۔

اقبال نے جہاں ظاہراً سوال کو روزی تک محدود رکھا ہے وہاں یہ وصف صاف معلوم ہو رہا ہے کہ ان کا مطلب اس سے کہیں زیادہ وسیع

ہے۔ وہ اس پر بھی زور دے رہے ہیں کہ تن کی ضرورتیں اس لئے خودی کو پوری کرنی لازم ہیں کہ اقدار اور مقاصدِ اعلیٰ کو ان ضرورتوں کی خاطر نہیں بیچنا نہ پڑ جاتے۔ خود کفیل آدمی دوسرے کے ہاتھ اپنے مقاصد کو فروخت نہیں کرتا اور اگر کبھی اتفاق سے تہی دستی بھی قسمت میں لکھی ہو تو وہ بھوکا رہنا پسند کرتا ہے۔ مگر اقدار کو نہیں بیچتا۔ مقاصد کو نہیں چھوڑتا۔

در تہی دستی شود خوددار تر　　　بخت او خوابیدہ او بیدار تر

یعنی وہ تہی دستی میں اور بھی خوددار ہوتا ہے۔ ہر چند کہ اس کا نصیبہ (روزی کے معاملے میں) سویا ہوا ہوتا ہے وہ پھر بھی اقدار کی نگہداشت کے لحاظ سے جاگا ہوا ہوتا ہے۔

افراد کی طرح اقوام کے معاملے میں بھی یہی اصول ہے اقوام کو بھی خود کفیل ہونا چاہئے اور اقدار کا کسی صورت میں سودا نہیں کرنا چاہئے۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا اور اپنے وسائلِ حیات پر اعتماد کرنا اور ان کو ترقی دینا اقوام کے لئے خودی کی حفاظت کی ضمانت ہے۔ جو قومیں دوسروں سے وسائل کی بھیک مانگتی رہتی ہیں وہ اپنے اقدار کو کبھی محفوظ نہیں رکھ سکتیں ـــ اور ایک وقت آتا ہے کہ پھر غلام ہو جاتی ہیں ـــ اور مسلمان اقوام کے لئے تو صرف یہ ہے ـــ

ہمت از حق خواہ و با گردوں ستیز
آبروئے ملتِ بیضا مریز